قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
[illegible] آنہ
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو ہند
ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

رجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۱
ٹیلیفون نمبر ۲۹
تار کا پتہ
"انجمن"
علی گڈھ

جلد ۱۶ | علیگڈھ ۔ ۱۵ مارچ ۱۹۵۷ ع | شمارہ ۱۱

رفتار

خلیل الرحمن اعظمی

کل شام کو ایک بزرگ سے ملاقات کرکے واپس آرہا تھا۔ راستے میں ایک دوست مل گئے۔ پوچھا "کہاں سے آرہے ہو؟" میں نے کہا "حضرت راز چاندپوری سے ملنے گیا تھا۔" بولے "یہ کون صاحب ہیں؟" اس سوال پر پہلے تو مجھے بہت غصہ آیا لیکن بعد میں سوچا کہ دراصل ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ راز چاندپوری سے واقف بھی ہوں تو کیوں کر۔ وہ مشاعروں کے شاعر ہیں نہیں۔ ان کا کلام آج کل ادبی رسالوں میں شائع نہیں ہوتا۔ کوئی نقاد اپنے مضامین میں نہ اُن کا نام لکھتا ہے اور نہ ہی ان کے کسی شعر کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں زمانہ پریس کانپور سے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "دنیائے راز" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جوش، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، حامد اللہ افسر اور روش صدیقی وغیرہ کو نوجوان اور ہونہار شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ راز چاندپوری نے بھی رومانی انداز میں عشق و محبت اور مناظر فطرت پر چند خوبصورت نظمیں لکھی تھیں۔ کچھ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے تھے۔ ان نظموں کو منشی پریم چند، سدرشن اور منشی دیا نرائن نگم نے خاص طور سے سراہا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم نے نہ صرف یہ کہ زمانہ میں ان کا کلام شائع کیا بلکہ اپنے رسالے کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی مقرر کیا۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں جاری رہا۔ اس کے بعد راز صاحب گورنمنٹ کی ملازمت کے سلسلے میں جہاں پور چلے گئے۔ مزاج کے اعتبار سے یوں بھی خلوت پسند ہیں۔ کان پور میں "انجمن آئینہ ادب" کے نام سے ایک ادبی جماعت تھی جو کبھی کبھار جلسے اور مشاعرے کیا کرتی تھی۔ اس انجمن میں ان کے کئی قریبی دوست تھے جو کھینچ لے جاتے تھے اور اس طرح پر تھوڑی بہت "رونمائی" ہو جاتی تھی۔ کان پور چھوڑا تو یہ بھی ختم۔ اب شاعری کرتے تھے لیکن اپنی تسکین کے لیے۔

خود اپنا حال کہنا خود اُس سے لطف لینا
حاصل ہے راز اتنا بس ذوق شاعری کا

چھپنے چھپانے کا کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ منشی دیانرائن نگم بہت تاکید سے خط لکھتے تو ایک آدھ غزل یا نظم بھیج دیتے ورنہ وہ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری جب پختگی کو پہنچی تو ان کی بیاض میں دفن ہوکر رہ گئی۔ یہ زمانہ یوں بھی بالشتیوں اور پروپیگنڈے کا ہے۔ اپنا وجود منوانے کے لئے شاعر اور ادیب کو نہ جانے کیا کیا حربے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ مخزن اور زمانہ کی جلدیں کتنے لوگوں کے پاس ہیں اور اگر موجود ہیں تو نئی نسل انھیں بہت کم اٹھاتی ہے۔ اردو رسالوں کے قاری کا حافظہ بقول اختر انصاری دہلوی بھی کمزور ہوتا ہے۔ کتنے ہی اعلیٰ درجے کے شاعر و ادیب محض اس لیے لوگوں کے ذہن سے محو ہوگئے کہ ان کی تحریریں کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئیں۔ آج مہدی افادی، سجاد انصاری یا عظمت اللہ خاں کو کون جانتا۔ اگر ان مرحومین کی بکھری ہوئی تحریروں کو ان کے عزیز و اقارب اکٹھا کرکے شائع نہ کرتے۔ اب بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے میر ناصر علی دہلوی، [illegible] اکبر آبادی، میر افضل علی، احمد حسین ادیب، اور [illegible]

کا نام تو شاید سنا ہو لیکن ان کی کوئی چیز شاید ہی انھوں نے پڑھی ہو۔ دور کیوں جایئے اقبال احمد سہیل، مسعود علی ذوقی، مرزا عباس بیگ مختر اور مجنوں حسین احمد پوری وغیرہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے بعض مخصوص امکانات کا جائزہ لیا لیکن ان کی صفات سے لوگ اس لئے واقف نہیں ہیں کہ کسی پبلشر نے ان کے کلام کے مجموعے نہیں شائع کئے۔ عبدالقادر سروری نے "جدید اردو شاعری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس وقت جدید شاعری فیض، راشد، میراجی یا مجاز اور جذبی تک بھی نہیں پہنچی تھی بلکہ جوش اور حامد اللہ افسر وغیرہ سے عبارت تھی۔ سروری نے اس وقت اپنی کتاب میں راز چاندپوری کا بھی ذکر انھیں ہونہار شاعروں میں کیا تھا لیکن ہونہار کے جب کچھ ہونے کے دن آئے تو وہ محفل سے غائب تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے یہ گمان ہوا۔

نہ دنیا مجھ سے واقف ہے نہ آئین محبت سے
میں جاؤں تو کہاں جاؤں نکل کر کنج خلوت سے (راز)

لیکن اس "کنج خلوت" میں وہ دنیا کو خوبصورت بنانے کا خواب دیکھتا رہا۔ اس امید پر کہ

تصویر جہاں میں رنگ بھرنا
تخلیق جہاں سے کم نہیں ہے (راز)

لیکن اس تخلیق کو بازار میں وہ نہ لائے تو کون لائے اور اگر یہ تصویر شہر کی دیواروں پر اشتہار بن کر چسپاں نہ ہوگی تو اس پر کس کی نگاہ پڑے گی۔ اس کے بارے میں اگر میں کچھ کہوں تو شاید لوگ پکار اٹھیں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" لیکن کیا کیا جائے کہ یہ مشک تو ابھی "نافۂ آہو" کی صورت میں ہے۔

بہرحال آج کی صحبت میں اپنی ذاتی بیاض سے راز چاندپوری کی غزلوں کے کچھ شعر ادھر ادھر سے سنانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

وہ آتش گل شباب پر ہے ذرہ ذرہ ہوا ہے روشن
ہے محو خرام ناز کوئی کانٹے کہیں تھام لیں نہ دامن

دلکش ہے دل حسن بھی افسانۂ محبت شاید سنا سکوں گا تم کو کہیں کہیں سے

فیضان حسن سے معمور ہے فضائے جہاں ہر ایک ذرہ یہ کہتا ہے شاہکار ہوں میں
سینے میں دل دبا ہے مجھے لطف مرگ بھی اب کیا کہوں خدا سے میں اب کیا دعا کروں
حاصل زیست ہے کیا میکدۂ ہستی میں تلخی بادۂ امید گوارا کرنا
لذت کشش نظارہ ہے تیری نظر تو کیا

ابھی تو بے خودی ہو کہ حیرت کہیں جسے
دفتر عشق کی روداد کہئے دو مجھ کو جفائے حسن کا قصہ کہوں گا فرصت میں

آہ وہ دور زندگی، آہ وہ عہد سرخوشی
گردش روزگار سے خواب و خیال ہو گیا

غم ہائے دل گداز نے انسان بنا دیا
عالم اب اور ہے مری بزم خیال کا

ہائے وہ میری آخری حسرت، دل سے نکلی تھی جو دعا ہو کر
اپنے خلوص پر ہے مجھے ناز اعتماد نشتر زنی سے فکر کی میں بے خبر نہیں
شاعر خوش بیان کی باتیں حسن بھی عشق یاز ہوتا ہے
پابند قفس رہنا، مانوس قفس ہونا آسان بھی ہوگا اس دور میں مشکل ہے
آئینۂ حسن زندگی تھا اب کشتۂ عشق آرزو ہوں
افکار روزگار سے دل سرد ہو نہ جائے دہرا رہا ہوں قصۂ عہد شباب کو
کہاں سنتا تھا کوئی داستان عشق رسوائی
بنایا ہے مگر حسن بیاں نے دلنشیں سنے

یہ بزم دہر اور یہ ہنگامۂ روزگار مدت ہوئی زیارت انساں کئے ہوئے
دنیا بھی مدعی ہے زمانہ بھی خود فروش الزام عاشقی ہے مگر میرے سر ابھی
فلسفۂ حال دے مجھے درس نہ اضطراب کا

میری نگاہ میں ابھی جلوۂ بزم دوش ہے
کیا میں اور نہیں کوئی دانے بحر میں
لیکن اے دوست مرا حسن نظر عام نہیں
مایوس نہیں ہوں میں ابھی اہل جہاں سے مانا کہ مرا کوئی ہم آواز نہیں ہے
وہ ذوق شعر گوئی ہی نہیں اے راز کیا غم ہے
بدلا تھا کسی صورت سے رنگ اپنی طبیعت کا

ان چند چند اشعار سے بھی یہ آواز پہچانی جا سکتی ہے۔ راز کے لب و لہجہ میں گداز اور نشتریت کے ساتھ ایک مبتلی ہوئی کیفیت ہے۔ ان کے یہاں متانت کے ساتھ ایک طرح کے خلوص اور قربت کا بھی احساس ہوتا ہے ان کی زندگی عام طور پر افکار و آلام میں گزری ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہ زندگی کی تلخیوں کے ساتھ نباہ کرتے رہے ہیں۔ اس زہر کو انھوں نے اس طرح ہضم کر لیا ہے کہ ان کی آواز میں ایک قسم کی حلاوت پیدا ہو گئی ہے اور ان کی شاعرانہ مہارت سے قطع نظر یہ خود ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں۔ چاندپور کی سرزمین نے قائم کے بعد ایک اور شاعر پیدا کیا ہے جس کا منصب پہچانا جاتا ہے۔

خط کتابت

صرف جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے پتے پر ہونی چاہیے۔

ہماری زبان

۱۵- مارچ ۱۹۵۷ء

انجمن کی کانفرنس

فروری میں مجلس عام کا جو جلسہ ہوا تھا اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ ۳۰، ۳۱- مارچ کو انجمن کی کانفرنس کی جائے۔ اس سلسلے میں جو خطوط لکھے گئے اور کارکنوں سے تبادلۂ خیالات کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تاریخیں اس اجتماع کے لئے موزوں نہیں ہیں ابھی انتخابات کے نتیجے نکل رہے ہیں۔ چند روز کے بعد نئی وزارتوں کے قیام کا مسئلہ سامنے آئے گا۔ عام طور پر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ یہ نقشہ بن جائے تو آئندہ کام کی طرح ڈالیں۔ اپریل کے آغاز سے رمضان شروع ہو جائے گا۔ اور اس زمانے میں متعدد ممبروں کو شرکت میں زحمت ہوگی۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوا کہ یہ کانفرنس شروع مئی میں ہو۔ اس زمانے میں موسم کچھ گرم ضرور ہوگا مگر لوگوں کو قدرے فرصت بھی ہوگی اور اطمینان سے تمام مسائل پر غور و خوض ہو سکے گا۔ شاخوں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ناشرین اور صحافی اپنے مسائل پر سوچی ہوئی باتیں کہہ سکیں گے۔ عنقریب کانفرنس کی تاریخوں کا اعلان کیا جائے گا۔ مگر یہ طے ہے کہ یہ کانفرنس مئی کے پہلے ہفتے میں ہوگی۔ علی گڑھ میں اس وقت یونیورسٹی کے امتحانات شروع ہونے والے ہیں اور مہمانوں کے قیام و طعام کے انتظامات کے سلسلے میں بھی دشواریاں ہیں۔ مئی میں اس کا بھی انتظام ہو سکے گا۔ ہمیں امید ہے کہ کانفرنس کی تاریخوں میں اس تبدیلی کو لوگ پسند کریں گے۔

راشٹر بھاشا پرچار سمتی اور اُردو

راشٹر بھاشا پرچار سمتی وردھا ہندی کی اشاعت کے سلسلے میں جو کام کر رہی ہے وہ قابل قدر ہے۔ اس کے چلانے والے اچھے اور نیک نیت لوگ ہیں مگر بعض اوقات نادانستگی میں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جن سے گمراہی پھیلتی ہے اور انصاف کی روح مجروح ہوتی ہے۔ اس سمتی نے کچھ درسی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اس کی تیسری پستک میں جو جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی ہے اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ سترھویں باب میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"ہندی جب فارسی لپی میں لکھی جاتی ہے تب اُسے اردو کہتے ہیں"

یہ بات صحیح نہیں۔ ہندی اور اردو دونوں کھڑی بولی سے نکلی ہیں۔ دراصل یہ ایک بولی کے دو ادبی روپ ہیں اور اب دونوں کی مستقل اور آزاد حیثیت ہے۔ اس بنا پر دونوں کو دستور میں علیحدہ جگہ دی گئی ہے۔ اردو اگر ہندی رسم خط میں لکھی جائے تو ہندی نہیں ہوتی اور ہندی اگر اردو رسم خط میں لکھی جائے تو اردو نہیں کہلائی جا سکتی۔ فرق صرف الفاظ و اصطلاحات کا نہیں، حروف، محاورات اور اسلوب کا بھی ہے۔ اس فرق کو کم کرنے کی کوشش اچھی ہے۔ مگر اسے نظر انداز کرکے دونوں کو ایک کہنا گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

اسی باب میں ایک دوسری جگہ ہندستان کی اہم بھاشاؤں کے نام دیے گئے ہیں۔ ان میں اردو کا نام کہیں نہیں۔ ایک ایسی زبان کو جو ہندستان کی چودہ قومی زبانوں میں سے ہے، جس کے بولنے والے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جس کا ایک شاندار ادب ہے اور جس میں سب سے زیادہ اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں نظر انداز کر دینا، زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ راشٹر بھاشا پرچار سمتی وردھا کی کتابوں میں ایسی غلطیاں افسوسناک ہیں امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی صحت کر دی جائے گی لیکن جو غلط فہمی اور گمراہی پھیل چکی ہے اس کا ازالہ کون کرے گا۔

شری بی جی کھیر

شری بی جی کھیر کا انتقال ایک قومی حادثہ ہے۔ کھیر صاحب ہمارے ممتاز قومی رہنماؤں میں سے تھے اور ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ بمبئی کے بڑے وزیر لندن میں ہندستان کے ہائی کمشنر اور سرکاری زبان کمیشن کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے ملک و قوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اگرچہ سرکاری زبان کمیشن کی سفارشیں ابھی شائع نہیں ہوئیں، لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے انھوں نے اس کے صدر کی حیثیت سے ہندستان کی تمام قومی زبانوں کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ جہاں جہاں وہ گئے سرکاری زبان کے متعلق انھوں نے نہایت متوازن خیالات ظاہر کئے اور اردو کے اداروں اور کارکنوں کے سامنے انھوں نے اردو زبان و ادب کی بڑی ہمت افزائی کی۔ ان کے انتقال سے گاندھی جی کی صف کا ایک اور مجاہد کم ہو گیا۔

اردو دنیا

شاندار روایات

پچھلے ہفتے جناب ساقر نظامی نے حیدرآباد آل انڈیا ریڈیو کے ایک مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے حیدرآباد کی شاندار ادبی اور تہذیبی روایات کا ذکر کیا اور اردو کے فروغ میں اس کی کوششوں کو سراہا۔ اس موقعے پر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے وسیع احاطے میں شہر کی ممتاز خواتین اور حضرات موجود تھے۔

اردو کالج

حیدرآباد (دکن) کے بعد اب بہار میں ایک اردو کالج کے قیام کی تجویز زیر غور ہے۔ معاصر "ہمدم" کی اطلاع ہے کہ ایوت محل میں قاضی سید کریم الدین صاحب ایڈوکیٹ ممبر راجیہ سبھا کے دولت کدے پر ایک خاص جلسے میں مجوزہ اردو کالج کے لئے ایک اکسپرٹ کمیٹی بھی بن گئی ہے۔

عوام کی زبان

جاورہ میں ایک شاندار مشاعرہ اندور کی خاتون لیڈر محترمہ زہرہ رانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ رانی صاحبہ نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ اردو ہندستان کے عوام کی دستوری زبان ہے اسے کوئی برباد نہیں کرسکتا۔ مشاعرے میں شمیم فرحت کی نظم کشمیر بہت پسند کی گئی اور انھیں پانچ اداروں کی طرف سے میڈل دئے گئے۔

مزاحیہ مشاعرہ

لکھنؤ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے مارچ کے دوسرے ہفتہ میں ایک دلچسپ مزاحیہ مشاعرہ نشر کیا گیا۔ مشاعرے میں شہر کے بہت سے اہل ذوق موجود تھے۔ شاعروں میں سے اختر بھپھوندوی۔ کیتب علیگ، شوق بہرائچی، سرورش مچھلی شہری، جلال ملیح آبادی کے علاوہ لکھنؤ سے آفتاب لکھنوی، بوڑھم لکھنوی، رنگین لکھنوی، جھنجھٹ لکھنوی، ناوک لکھنوی، وحید لکھنوی، بازل لکھنوی، ناچیں لکھنوی اور عنقا لکھنوی نے شرکت فرمائی۔

انتخابات اور اردو

جناب منظور الحسن صاحب برکاتی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹونک اطلاع دیتے ہیں۔

ہمارے صوبہ راجستھان میں ۲۵۔ فروری کو عام انتخابات شروع ہوئے۔ دوسرے صوبوں کی طرح یہاں بھی مختلف سیاسی پارٹیوں نے اپنے نمائندے کھڑے کئے اور انتخابات میں کامیابی کے لئے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جن سے عوام یا جمہوریت اور رائے دہندگان کی حمایت حاصل کی جاسکتی ہے

اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ٹونک اور جے پور اور راجستھان کے دوسرے اضلاع میں امیدواروں نے اپنا پروپیگنڈہ کرنے، اپنی آواز اور مقصد کو عوام تک پہنچانے کے لئے جس زبان کو انتخاب کیا وہ 'اردو زبان' تھی۔

راجستھان، ہندستان کا ایک ایسا صوبہ ہے۔ جہاں اردو زبان کو نہ صوبائی زبان کی حیثیت حاصل ہے اور نہ علاقائی، لیکن اس کے باوجود یہاں کے لاکھوں باشندے اردو زبان بولتے سمجھتے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو راجستھان کے چپے چپے پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی انتخابی مہم میں نشرواشاعت اور پروپیگنڈے کے لئے ہر پارٹی اور ہر امیدوار نے اسی زبان کو اختیار کیا۔ درجنوں نیتاؤں نے اس زبان میں تقریریں کیں اور سیکڑوں نہیں ہزاروں اشتہار، پمفلٹ، پوسٹر اور ہینڈ بل اس زبان میں شائع کئے گئے۔

دلی کے نامہ نگار لکھتے ہیں کہ الکشن کے سلسلے میں تمام پارٹیوں نے پوسٹر اور ہینڈ بل وغیرہ اردو میں دل کھول کر استعمال کئے دلی کے گلی کوچوں اور سڑکوں کے اطراف کی دیواریں اردو پوسٹروں سے پٹی ہوئی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن سنگھ نے بھی اسی "نامبارک زبان" میں اپنا پروپیگنڈہ زور شور سے کیا۔

حیدرآباد اور اطراف کی اطلاعوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں تو یہ رنگ اور جگہوں سے زیادہ تیز تھا۔ تلگو بھی ساتھ ساتھ رہی مگر اردو کا حصہ غالب رہا۔

یو۔ پی کانگریس کے شعبۂ نشرواشاعت نے بڑے دھڑلے کے ساتھ اردو استعمال کی۔ بے شمار پوسٹر اور دیگر مطبوعات اردو میں شائع کی گئیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں کو تو اس کے استعمال میں کوئی تکلف پہلے ہی سے نہ تھا البتہ حکومت نے اپنی روایتی روش میں فرق نہیں آنے دیا۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کے بڑے بڑے کرتا دھرتاؤں نے اردو ہی میں عوام کو مخاطب کرنا مناسب سمجھا۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

انجمن کی خبریں

دہلی

یوم غالب

انجمن ترقی اردو شاخ دہلی نے حسب معمول اس سال بھی یوم غالب بڑے اہتمام سے منایا ۲۲، فروری ۵۷ء پو نشستہ کھیا بستی نظام الدین میں مزار غالب کے قریب ۳ بجے دہلی کے ادیب، شعراء صحافی اور علم دوست حضرات اور عوام کا ایک اجتماع یوم غالب کی تقریب میں حصہ لینے کے لئے جمع ہوا۔ جلسہ سے قبل مزار غالب پر گل افشانی کی گئی۔ اس موقع پر مزار پر چادر چڑھانے کے علاوہ مقبرے کی جالیوں کو پھولوں کے ہاروں اور بجلی کے رنگ برنگی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔

محبت کی نشانی

۳/۱ ۳ بجے کے قریب جناب خواجہ غلام السیدین سکریٹری مرکزی وزارت تعلیم کی صدارت میں جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی پنڈت سندر لال صدر انجمن ترقی اردو ہند شاخ دہلی نے صدارت کی تحریک پیش کرتے ہوئے حضرت غالب کو خراج عقیدت پیش کیا اور اردو کے متعلق فرمایا کہ یہ محبت کی نشانی ہے جسے اس ملک کے بہترین دماغوں نے مل جل کر بنایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زبانیں ہمیشہ دوسری زبانوں کے ملاپ اور اتحاد سے بنتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان بھی دوسری زبان کو مٹا کر یا دبا کر ترقی نہیں کرسکتی۔ اردو زبان کی ہمہ گیری پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت سندر لال نے کہا کہ جب میں روس گیا تھا تو وہاں میں نے ایک روسی پروفیسر کو ایسی شستہ اور بلیغ اردو میں تقریر کرتے ہوئے سنا کہ جس کو سن کر شاید اہل دہلی کو بھی رشک آجاتا۔ موصوف نے فرمایا کہ اردو ہندی ماں جائی بہنیں ہیں اس لئے ہندی والوں کو اردو سے نفرت نہیں کرنا چاہئے۔ پریم اور محبت سے ہندی اور اردو دونوں ہی کا بھلا ہوگا۔ آخر میں پنڈت جی نے فارسی کا یہ شعر پڑھا ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

خواجہ غلام السیدین صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں مرزا غالب کی شاعری اور نثر نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی شاعری میں جہاں ایک طرف بھرپور رنگ تغزل اور حسن و عشق کے ولولے اور ہجر کی بیقراری نظر آتی ہیں تو دوسری طرف اس میں صوفیانہ بلندیاں معرفت کی گہرائیاں اور فلسفیانہ [illegible] ہوتے ہیں۔ عشق اور مجاز جو اردو اور فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں اپنی تمام تر رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ غالب کی شاعری میں موجود ہیں۔ غالب کی شاعرانہ طبیعت اور حساس فطرت کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ غلام السیدین نے کہا کہ وہ صحیح معنوں میں انسان دوست اور صلح کل فطرت رکھنے کے ساتھ ہی انانیت پسند بھی تھے اس لئے زمانہ کی ہر ٹھوکر کو انھوں نے ہمت سے جھیلا لیکن شکست کبھی قبول نہیں کی۔ غالب غم روزگار اور ماتم زندگی کے ہر حلقہ کا شکار ہوئے مگر ان کے لب و لہجہ میں کوئی تلخی نہ آئی۔

غالب کے اشعار اور ارشادات کی عمومیت کا ذکر کرتے ہوئے سیدین صاحب نے کہا جس طرح زبان انگریزی کے ادبی حلقوں میں شکسپیر کی تحریروں کے ذکر کے بغیر گفتگو نامکمل اور پھیکی رہ جاتی ہے اسی طرح اردو کے حلقوں میں غالب کے اشعار اور ارشادات کے استعمال کے بغیر گفتگو ادھوری رہ جاتی ہے۔ غالب کی غزلوں کا اقتباس پیش کرتے ہوئے سیدین صاحب نے کہا کہ غالب کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے اور ان کا انداز بیان اتنا رنگا رنگ اور دلکش ہے جو دوسرے اردو شعراء کو میسر نہیں۔ آخر میں سیدین صاحب نے غالب کے خطوط سے اقتباسات پڑھ کر سنائے اور کہا کہ غالب کا دل و دماغ کوتاہ نظری عصبیت اور فرقہ پرستی سے بالکل پاک تھا اور مذہبی قیود سے ان کی نظر بہت اونچی تھی اس لئے بلحاظ انسان بھی وہ ہندوستان کی ایسی محبوب اور محترم ہستی تھے جن کو آج بھی ہر فرقہ کے لوگ اپنا ہی سمجھتے ہیں۔

خطبۂ صدارت سے قبل شمیم کرہانی نے ایک دلکش نظم سنائی۔ یہ نظم مزار غالب پر بیٹھ کر کہی گئی تھی اور اس کا عنوان تھا "غالب"۔

بیگم صالحہ عابد حسین نے ایک مزاحیہ مضمون پڑھا جس کا

عنوان تھا غالب کا یہ شعر ہے

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اس افسانوی مضمون میں غالب کے سادہ اور پرکار اشعار نہایت دلاویز انداز میں غالب کی بیوی امراؤ بیگم سے منسوب کر دیے گئے تھے بیگم صالحہ عابد حسین کے انداز نگارش کو بیحد پسند کیا گیا اور حاضرین نے اس انوکھے طرز بیان کی پرزور تالیوں سے داد دی۔

مقالات :در تقاریر کے درمیان غالب کا فارسی اور اردو کلام جناب عرش ملسیانی اور جناب شہریار پرواز نے ترنم سے پڑھا۔

غالب کی طرح میں ترتیب دیے ہوئے پروگرام کے تحت جناب تلوک چند محروم اور حضرت مانی جائسی نے فارسی میں اور روش صدیقی ساحر نظامی۔ گوپی ناتھ امن۔ جگن ناتھ آزاد حسن نعیم نے اردو میں غزلیں سنائیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے غالب بحیثیت انسان، کے عنوان پر بڑے دل نشیں انداز میں تقریر کی۔ آخر میں شریمتی سرلا کیمو نے غالب کی غزل دلاویز ترنم میں سنائی اور اس غزل پر یوم غالب کی پہلی نشست ختم ہوئی

یوم غالب میں شرکت کرنے والوں میں روس کے تین اردو ریسرچ اسکالرز بھی شامل تھے اور جلسہ کے اختتام پر ان روسی مہمانوں نے اردو ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں سے تبادلہ خیال کیا۔

یوم غالب کی دوسری نشست سات بجے شام کو شروع ہوئی اس نشست میں غالب کا کلام دلی کے قوالوں نے پیش کیا حاضرین نے بہت ذوق و شوق سے سنا اور بیحد پسند کیا۔

دوسری نشست بخیر و خوبی آٹھ بجے رات کو ختم ہوئی۔

(سید احمد جواد، جوائنٹ سکریٹری انجمن شاخ دہلی)

اُردو کا مستقبل

جناب ساحر نظامی نے مارچ کے پہلے ہفتے میں حیدر آباد دکن کے اردو کالج میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو نے عوام ہی میں جنم لیا ہے اور عوام ہی نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ حکومت کی اس کو کبھی پشت پناہی حاصل نہیں رہی۔ انھوں نے اردو کالج کے قیام پر مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے والوں کے لیے بلا شبہ یہ ایک مژدہ ہے۔ امید ہے کہ یہ اقدام ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اردو کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

کشمیر میں انجمن

بزم اردو کشمیر کی مجلس عاملہ نے یہ طے کیا ہے کہ کل ہند انجمن ترقی اردو کی شاخ کشمیر میں قائم کر دی جائے تفصیلی اطلاع آئندہ اشاعت میں دی جائے گی۔

غالب

یہ وہ نظم ہے جسے شمیم کرہانی نے غالب کے مزار پر بیٹھ کر لکھا اور وہیں انجمن کے جلسے میں سنایا تھا۔

کعبۂ اہل نظر مدفن غالب ہے یہی
تو خواب اک دل بیدار اسی خاک میں ہے

ہے اسی قبر میں گنجینۂ معنی کا طلسم
جنس حکمت کا خریدار اسی خاک میں ہے

ہے یہیں دفن حریف مے مردافگن عشق
بادۂ غم کا قدح خوار اسی خاک میں ہے

سو رہا ہے یہیں نقاش اجنتائے غزل
ادبی تاج کا معمار اسی خاک میں ہے

شام دینا و مرو ابرو شفق ہے یہیں دفن
سحر چشمہ و کہسار اسی خاک میں ہے

ابر آلودہ سحر کا ہے شرابی یہیں قید
چاندنی رات کا میخوار اسی خاک میں ہے

صاحب سیف تھے سو پشت سے جنکے اجداد
ہائے وہ ترک طرحدار اسی خاک میں ہے

قیدی رشتۂ تسبیح یہیں ہے محبوس
بستۂ حلقۂ زنار اسی خاک میں ہے

دیکھ کر تیرہ جو کعبے کو پلٹ آتا تھا
ہائے وہ جذبۂ خوددار اسی خاک میں ہے

یہیں مدفون ہیں خودبینی و دانش کے صنم
ایک بت خانۂ پندار اسی خاک میں ہے

شارح خواب تخیل ہے یہیں پوشیدہ
خالق سیرت و کردار اسی خاک میں ہے

تھا جو ناکردہ گناہوں کی سزا کا طالب
وہ جواں مرد گنہگار اسی خاک میں ہے

ڈالتا ہے جو زمانہ پہ ابد کا پرتو
میرے ماضی کا وہ مینار اسی خاک میں ہے

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
ادب ہند کا شہ کار اسی خاک میں ہے

معنی و ہیئت و اسلوب کا سرخیل پیام
فکر کا قافلہ سالار اسی خاک میں ہے

جس کی رعنائی افکار پہ عالم کو ہے رشک
ایشیا کا وہ فنکار اسی خاک میں ہے

غیر معروف شعراء (۲)

خیراتی خاں دل سوز

فخرالدین احمد

خیراتی خاں دلسوز افغان نسل کے اور سپاہی پیشہ تھے۔ خمخانۂ جاوید میں انھیں باشندۂ علی گڑھ لکھا ہے۔ لیکن یہ دراصل تپّل کے رہنے والے تھے جو علی گڑھ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے قیام دہلی اور اجمیر بھی ثابت ہے۔ خوش طبع، یار باش، اور لطیفہ گو تھے اس لئے نواب ظفریاب خاں خلف سمرو کے پاس رسائی حاصل کی اور عمر اس کی ملازمت و رفاقت میں بسر کرنے لگے۔

ظفرالدولہ مختارالملک نواب ظفریاب خاں بہادر نصرت جنگ خود شاعر تھا اور صاحب تخلص کرتا تھا۔ ذکا لکھتا ہے کہ وہ سپہ گری کے علاوہ موسیقی اور مصوری میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ علوم رسمیہ سے بہرہ مند تھا اور دہلی کے قیام کے دوران میں اس کے یہاں مشاعرے اور مراختے کی مجلسیں مرتب ہوتی تھیں جس میں جملہ شعرائے دہلی شریک ہوا کرتے تھے۔ ذکا بھی اکثر اس محفل میں شریک ہوتا اور طرحی غزلیں پڑھتا تھا۔ شیفتہ نے اسے دلسوز کا شاگرد لکھا ہے۔ مصنف طبقات سخن کا قول کہ دلسوز کے والد سمرو کے بیٹے کی صحبت میں تھے درست نہیں ہے۔

قاسم اور کریم الدین دلسوز کو شاگرد شاہ ولی اللہ فراق لکھتے ہیں لیکن نساخ اور شیفتہ انھیں نصیر دہلوی کا شاگرد بتاتے ہیں۔ خوب چند ذکا جو خود شاہ نصیر کا شاگرد ہے لکھتا ہے کہ دلسوز اپنا کلام فراق اور نصیر دونوں کو دکھاتا ہے کلام کے بارے میں لکھا ہے "جودت طبع بدرجۂ اتم دارد کہ غزلیات و قصائد و رباعی وغیرہ اکثر بہ متانت و فصاحت سرانجام مے یابد۔ کلامش مزہ دارش رقیبہ پیدا کردہ و خالی از کیفیت درد جستگی نیست"

زندگی کے زیادہ حالات معلوم نہیں۔ شراب نوش بلا کے تھے۔ طبقات سخن میں ہے کہ بعد کو انھوں نے شراب نوشی چھوڑ دی تھی۔ جوانی ہی میں بے پروٹیں وفات پائی۔ خمخانہ میں سال وفات ۱۸۲۵ء درج ہے۔

دیوان غالباً ترتیب نہ پا سکا، تھوڑے بہت شعر تذکروں میں ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں۔ کسی تذکرے میں بھی ان کی کوئی مکمل غزل دیکھنے میں نہیں آئی۔ تیرھویں صدی کی ابتدا کی مرتب کردہ ایک بیاض میں جو غالباً سعادت یار خاں رنگین کے پاس رہ چکی ہے اور جس میں کچھ اضافے رنگین کے قلم کے معلوم ہوتے ہیں۔ دلسوز کی چند غزلیں موجود ہیں لیکن ان کی بھی تعداد زیادہ نہیں (اس بیاض کا تعارف آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے)

خیراتی خاں دلسوز کے ہاتھ کی تحریر راقم الحروف کو صرف ایک جگہ دیکھنے میں آئی۔ یہ تحریر کتب خانہ نیو کالج، ایڈنبرا یونیورسٹی، (اسکاٹ لینڈ) میں محفوظ ہے۔ وہاں دیوان سودا کا ایک نسخہ ہے جو مکمل طور پر دلسوز کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں ترقیمہ کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

"بہ اختتام رسید این کتاب تصنیف مرزا رفیع السودا مغفور بتاریخ بیست و پنجم شہر رمضان المبارک سنہ جلوس ..... شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ راقم ضعیف نحیف داعی شب و روز خیراتی خان دلسوز حسب الارشاد نواب صاحب خداوند خداوندگان فیاض حالیان، نوازش فرمائے بیکساں، نواب ظفریاب خاں بہادر دام اقبالہ و جلالہٗ"

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔ یہ اشعار بیاض رنگین سے لئے گئے ہیں۔

قرار دے گئی اک ناز نیں پردے میں ۔ نگاہ رو گئی رخ کے ہیں پردے میں

○

اس شعلہ رو سے کل جو مری آنکھ لڑ گئی ۔ میں کیا کہوں کہ بجلی سی اک مجھ پہ پڑ گئی

میری اور اس کی آہ نہ کیاں کچھ بنی ۔ گر آہ بن گئی تو دہیں کل بگڑ گئی

آتی ہے آہ سینے سے ہر دم جو بولئے — کس کی نگاہِ مست مرے دل میں گڑ گئی
اس دن سے زندگی مری آنکھوں میں شاق ہے — جس دن سے میری جان وہ مجھ سے بچھڑ گئی
پہلے سے ہی زبان کو بہنے کی کوشش — دل سوز اب تو کیجئے کیا بات بڑھ گئی

○

گزری شبِ فرقت تو پھٹ درد والم سے — پھر کچھ وہ دن کیوں کہ کٹے گا ترے غم سے
کچھ دل کو ہوس سیر گلستاں کی نہیں ہے — بہتر ہے گلی اس کی ہمیں باغ ارم سے
بیٹھا ہے جو کانٹے مرے دل میں یہ شلا — بجتا نظر آتا نہیں اب دیدۂ نم سے
کھلتے ہیں دیدار سے محروم ہیں آنکھیں — ملتا ہے جو یاد آکے کبھو خواب میں ہم سے
احوال گذشتوں کا کبھو پوچھئے کس سے — جو کوئی گیا پھر نہ پھرا ملکِ عدم سے
تاج زر و پاؤں میں دستور کے زنجیر — آباد ہے ویرانہ یہ بلکہ اس کے قدم سے

○

ہر گھڑی جھڑکی اور رکھائی ہے — یہ کوئی طرزِ آشنائی ہے
تیرے چہرے کو ماہ کیوں کر کہوں — اس میں ایسی کہاں صفائی ہے
دل پھنس کر کے اس کی زلفوں میں — جی کو ناحق بلا لگائی ہے
ابھی دل میں بھڑک اٹھی تھی آگ — آنسوؤں نے مرے بجھائی ہے

تو جو حیراں ہے آج اے دل سوز
کس کی تصویر یاد آئی ہے

باقی

○

مراسلات

ہماری صحافت

آپ کا ادبی و تعلیمی اخبار "ہماری زبان" زبان اردو کی نکاسی کرتا ہے ۔ یہ امر حقیقت پسند ہی خواہان اردو کے لئے باعث مسرت ہے ۔ ایک مشکل جو عام طور پر لائبریریوں کے لئے یا خانگی طور پر اخبارات اور رسالوں کے جاری کرتے وقت پیش آتی رہتی ہیں کہ کون سی ریاست میں کون سی نوعیت کے اردو اخبار یا رسالے شائع ہوتے ہیں ۔ اگر ادارہ ہماری زبان بھارت دیش میں اردو اخبارات اور جرائد کی معلومات حاصل کر کے ہماری زبان میں قسط وار ہی کیوں نہ چھاپتا رہے تو اردو پڑھنے کے لئے بڑے فائدے کا باعث ہوگا ۔ اگرچہ یہ کام بڑا اہم اور وقت طلب ہے مگر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس پر غور فرمائیں

محمد عثمان الینری (رباول)

اردو لغت

اردو لغت کا کام ضروری ہے لیکن اس کے لئے کافی وقت ، سرمایہ اور کتابوں کی ضرورت ہوگی ۔ ابھی تک لکھنؤ اور دہلی کی اردو پر کتابیں لکھی گئی ہیں ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اردو پر لغت تیار کیا جائے تو زبان کو کافی وسعت حاصل ہو سکے گی ۔

ہسٹری آف اردو لٹریچر کے ترتیب و تدوین کی خبر سے مسرت ہوئی ۔ امید ہے کہ یہ ضروری کام بھی انجام پا جائے گا ۔

عربی ادب کی تاریخ پر اردو میں کوئی کتاب نہیں ہے اگر کانفرنس اس ضرورت کو محسوس کرے تو میں اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکوں گا ۔

سید مجتبیٰ حسن کامون پوری
ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اہل ادب کا مشاعرہ

بزم اہل ادب توپ خانہ اجین کی جانب سے ۱۰ فروری ۱۹۷۸ء کو ایک غزلی مشاعرہ زیر صدارت عطا الٰہی صاحب عطا صدیقی گوالیاری منعقد ہوا ۔ سلطان احمد صدیقی صاحب (علیگ) نے نظامت کے فرائض انجام دئے

مندرجہ ذیل شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سرفراز فرمایا ۔ (۱) عطا صدیقی گوالیاری ۔ سلطان احمد صدیقی ۔ عادل مہدی ۔ حسرت آرشی ۔ کاشف الہاشمی ۔ راہی عنایتی ۔ محمود ۔ نعیم ادیبی ۔ صابر گلشن آبادی ۔ مقصود صاحب ۔ شبنم اجینی قمر اندوری ڈاکٹر مجیب ظاہر گلشن آبادی ۔ چاند جبل پوری ۔ دولت عیاں داڑی عبدالکریم صدیقی نیم سنگاپوری ۔ شری سدھیشر ۔ عبدالرحیم قیس ۔ عبدالعزیز آزاد محمد علی روشن ۔ مشاعرہ ۹ بجے رات سے ایک بجے رات تک ہوتا رہا ۔

(صابر گلشن آبادی پبلسٹی سکریٹری)

معاصرین

رودکی کا مزار

وسط ایشیا کے بہت سے شہروں اور گاؤں کے باشندے اپنے علاقے کو عظیم شاعر اور موسیقار عبداللہ ابوجعفر رودکی کا وطن بتانے کے لئے مدتوں سے بحث کرتے آئے ہیں۔ رودکی کا ہزار ویک صد سالہ یوم پیدائش عنقریب ہی دنوں میں منایا جانے والا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اس شاعر کی جائے ولادت و وفات کا تعین نہیں کیا جا سکا تھا اور نہ کوئی ٹھیک طور سے اس کا حلیہ اور اس کی شباہت بیان کر سکتا تھا۔ اسلام کسی انسان کی شبیہ بنانے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں رودکی کی شکل و شباہت کا اندازہ کسی قدر ان اشعار سے ہو سکتا تھا جن میں شاعر نے خود اپنا ذکر کیا ہے۔

صدرالدین عینی نے بعض عربی کتابوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رودکی کی ولادت اور وفات پنج رود کے علاقے میں ہوئی تھی جو پنج کند (علاقہ لینن آباد، تاجکستان) سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ انھوں نے پنج رود کے گاؤں میں رودکی کی قبر کا بھی تعین کر دیا تھا۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے تاریخی علوم اور سوویت علم الاقوام کے ماہر پروفیسر گراسیوف نے قبر دیکھی جس میں روایت کے مطابق رودکی مدفون تھا۔ قبر میں ایک ڈھانچہ ملا۔

پروفیسر گراسیوف کا کہنا ہے "ہمارے سامنے صرف یہی کام نہ تھا کہ ہم رودکی کی شبیہ بنائیں بلکہ اس بات کو بھی پایۂ یقین تک پہنچانا تھا کہ یہیں جو ڈھانچہ ملا وہ رودکی ہی کا ہے یہیں روایتوں اور خود شاعر کے کلام سے یہ معلوم تھا کہ رودکی نابینا تھا اور اس کے دانت نہیں تھے۔ قبر میں جو کھوپڑی ملی ہے اس میں بھی دانت نہیں تھے پشت سر کی ہڈی کی مخصوص امتیازی ساخت یہ بتاتی ہے کہ یہ کھوپڑی ایک نابینا انسان کی ہے۔ اب ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے رودکی کی قبر پالی ہے۔

جدید ترین مواد کے مطالعے سے اس بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ رودکی نے ۸۰۔۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(سوویت دیس)

اخبارات کا سروے

پنجاب یونیورسٹی کے جرنلسٹ ڈپارٹمنٹ نے اخبار پڑھنے والوں کا ایک سروے کیا ہے۔ طلبہ نے ایک سو روپے سے لے کر ایک ہزار روپے تک کی آمدنی کے ۲۴۳ لوگوں سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ ان کی اخبار بینی کا اندازہ کیا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں ۵۰ فیصدی انگریزی اخبارات، بیس فیصدی دیسی زبانوں کے اخبار پڑھتے ہیں اگر لگے ہاتھوں اردو اور ہندی اخبارات پڑھنے والوں کا تناسب بھی معلوم کر لیا جاتا تو زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہوتا۔ لیکن پھر بھی اس سروے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تعلیم یافتہ طبقے میں انگریزی اخبارات زیادہ مقبول ہیں۔ کچھ تو اس لئے کہ ان کی آن اور شان باقی رہے اور ان کے فیشن میں فرق نہ آسکے۔ اسی لئے انگریزی اخبار کا معیار زیادہ بلند ہے اور دیسی اخبارات اپنا خرچہ بھی نہیں نکال سکتے۔

(الجمعیۃ)

اردو فلم

سوویت نگار ہفتہ وار بمبئی نے مورخہ ۳ مارچ ۱۹۵۷ء جلد ۲ شمارہ ۹ میں اردو فلم کی مقبولیت پر ایک ایڈیٹوریل لکھا ہے جس کا اقتباس یہاں دیا جاتا ہے۔

"گزشتہ ۲۰ سال میں ہماری فلم نمائشوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان میں بنی ہوئی بڑی سے بڑی فلم بھی ایک علاقائی زبان کی اعلیٰ فلم کے مقابلے میں ہر اعتبار سے زیادہ کامیاب اور مقبول ثابت ہوتی ہے جن لوگوں نے ابھی بھیا چاریہ کو بنگالی فلم "ملن" میں دیکھا ہے وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ اس نے یوسف خاں کی اردو فلم "ملن" کی اداکاری کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھ کر معیاری اداکاری پیش کی تھی۔ مگر ایک ہی فلم کے بعد یوسف خاں دلیپ کمار بن گیا اور ابھی بھیاچاریہ کے لئے ابھی دلی دور ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تقریباً بنگالی زبان کی ہر فلم اردو زبان کی فلم سے کہیں زیادہ معیاری ہوتی ہے مگر مقبولیت اور کامیابی میں اردو زبان کی فلم کا کبھی مقابلہ نہیں کر پاتی بنگالی فلموں کے اداکار اپنی ہر فلم میں فن کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں مگر ان کی جانب کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جب کہ اردو فلموں کے ایک معمولی اداکار کے لئے فلم بین نظریں بچھائے رہتے ہیں۔ فلم سازوں کی ایک بڑی اکثریت (خصوصاً پنجابی فلم ساز و ہدایت کار) بہت پہلے سے اس راز کو جانتے ہوئے ہیں کہ

ہندی فلموں کو کامیاب بنانے کے لئے عام فہم اردو کا سہارا لینا بھی ضروری ہے اور جب کبھی کوئی خود سر اور ہٹ دھرم فلم ساز اس خصوصیت سے منہ موڑ کر اپنی ناؤ کو ہندی زبان کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ بولنے پر مجبور کرتا ہے تو اس کی اپنی ناؤ اس کا بیڑا کر دیتی ہے اور متواتر وہ کئی سال تک اپنے بجٹ سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتا۔ اردو کے بڑھتے ہوئے بین الاقوامی تقاضے کے پیش نظر خاص مارکیٹ کے لئے وہی فلم کسی حد تک منافع بخش ثابت ہو سکتی ہے جو اردو زبان میں بنائی جائے گی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان کی ہر فلم کو سنسر بورڈ کے سارٹیفکیٹ میں ہندی لکھا جاتا ہے مگر حکومت اور سنسر بورڈ کے ممبران کتنے ہی تنگ نظر کیوں نہ ہو جائیں فلم "پٹ رانی" اور فلم "مرزا غالب" کی زبان کا فرق یہ تنگ نظری دور نہیں کر سکتی فلم میں طبقہ درخت گننے کا عادی نہیں اس کو پھل کھانے اور مٹھاس سے لذت حاصل کرنے سے مطلب ہے اردو کو کوئی بھی نام دیا جائے اردو اردو ہی رہے گی۔ اور جو فلم ساز اپنی فلموں کو مقبول عام بنانا چاہتے ہیں وہ اس بنیادی راز سے بخوبی واقف بھی ہیں۔

(فن کار بمبئی)

اردو کا مستقبل

آسنسول کالج کا مشاعرہ

آسنسول کالج کے اردو داں طلبہ کی انجمن "فروغ ادب" کے زیر اہتمام کالج کا پہلا شاندار مشاعرہ کالج ہال میں منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت کالج کے وائس پرنسپل شری اے۔ آر بنرجی نے فرمائی۔ سب سے پہلے انجمن فروغ ادب کے جنرل سکریٹری کی انگریزی اور اردو رپورٹ عطاء الرحمن کیف اور زیڈ۔ اے خاں نے باری باری پڑھ کر سنائی۔ رپورٹ میں آسنسول کالج میں اردو کی تحریک کی مختصر تاریخ بیان کی گئی تھی۔ نیز کالج کی گورننگ باڈی سابق پرنسپل شری۔ بی۔ بی بھٹاچاریہ اور موجودہ پرنسپل شری بھوانجن رائے اور اساتذہ کا شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ اردو داں طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں اور یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ اب تک انجمن جس طرح ان کا تعاون حاصل رہا ہے آئندہ بھی ہمیشہ اردو داں طلبہ کے ساتھ ان کی ہمدردیاں جاری رہیں گی۔ رپورٹ میں لٹریری اینڈ ڈیبیٹنگ ڈیپارٹمنٹ ہندی اور بنگلہ کے سیکشن کے طلبہ کا بھی شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ وہ اردو کی ہر تقریب میں پورے طور پر ساتھ دیتے ہیں اور انجمن کامیاب بناتے ہیں اردو داں طلبہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

مشاعرے کے آغاز سے پہلے انجمن فروغ ادب کی "وال میگزین" "خیاباں" بابتہ ۵۶-۱۹۵۵ء کے سب سے بہترین افسانہ اور نظم لکھنے پر جناب زیڈ۔ اے خاں اور ادریس صمد کو ایک ایک کتاب انعام میں دی گئی۔ ادریس صمد کو مشاعرے میں ایک گیت پیش کرنے پر ہندی طلبہ کی انجمن ہندی ساہتیہ پریشد کے سکریٹری نے بھی ایک انعام دینے کا اعلان کیا۔

جناب میاں نظر احمد نے اردو ہندی کے مسئلے پر ایک نہایت جامع تقریر کی۔ ہندی ساہتیہ پریشد کے سکریٹری نے اردو کے گیت پر جو انعام کا اعلان کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے یہاں ہندی اور اردو کے طلبہ کے اندر ایک دوسرے کے لئے جو جذبہ خیر سگالی دیکھا ہے اسے دیکھ کر مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ اردو کا مستقبل ہندستان کی نئی نسل کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا۔

آخر میں انجمن فروغ ادب کے صدر پروفیسر شانتی آچاریہ نے اردو شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری میں ادبیت اور حقیقت پسندی کا بھرپور احساس پایا جاتا ہے

(اقتباس از عبرت کلکتہ)

اطہر ہاپوڑی کا انتقال

نفیس سندیلوی صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ مشق استاد و محقق فن شاعر مولانا اطہر ہاپوڑی نے ۲۵۔فروری ۱۹۵۶ء کو بوقت ۲ بج بمقام کراچی اس جہان فانی سے سفر آخرت فرمایا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۷۸ سال کی تھی۔ پچھلے سال مارچ ۱۹۵۵ء میں آپ "کل راجستھان اردو کنونشن" میں شرکت کی غرض سے کراچی سے جے پور تشریف لائے تھے۔ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ نے اپنی رپورٹ میں آپ کی اردو خدمات کو خاص طور سے تسلیم کیا ہے

امیر، داغ، تسلیم و جلال، ظہیر و حالی کی صحبتوں میں آپ نے غزلیں پڑھی تھیں۔ مرزا کمال الدین شجر ژند ایرانی شاعر دربار رامپور اور جلال لکھنوی سے اکثر مسائل شعری پر بحثیں ہوئیں۔

آپ رام پور، گوالیار، جے پور اور ٹونک وغیرہ ریاستوں میں وکیل و منصف رہے ۴۷ سال جے پور میں قیام رہا ۱۹۴۸ء میں سے آپ پاکستان تشریف لے گئے۔ آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ گلستان اطہر۔ بہت ضخیم دیوان ہے جو ۲۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے
۲۔ مجموعہ قصائد اردو (۳) مجموعہ فارسی غزلیات و قصائد۔
(۴) قطعات تاریخ و مراثی و سلام (۵) رسالہ تحقیقات الفاظ۔
۶۔ جدید عروض ناتمام (۷) اصلاح شعر مرتبہ نفیس سندیلوی۔
(۸) مثنوی لیلۃ الاسری لغت میں شب معراج کا حال ہے (۹) مکتوبات شعری تحقیقی ادبی خطوط کا مجموعہ (۱۰) افکار التفات دو حصے۔

لکھنؤ

احتشام حسین

لکھنؤ کو چاہے رام چندرجی کے بھائی لچھمن جی نے آباد کیا ہو یا راجہ یدھشٹر کے پوتے۔ راجہ جنم جی نے یہ خطہ رشیوں اور منیوں کو اپنے آشرم بنانے کے لئے دے دیا ہو۔ یہ شہر بہت قدیم ہو یا اکبری عہد سے پہلے اس کی کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن اودھ کا علاقہ قدیم الایام سے تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس کو علمی اور ادبی مرکزیت البتہ اٹھارویں صدی میں حاصل ہوئی جب یہاں باقاعدہ اس سلطنت کی بنیاد پڑی جسے آسانی کے لئے اودھ کی حکومت کہہ سکتے ہیں اور جس کا خاتمہ ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ شاہی اور جاگیرداری نظام میں شہروں اور مرکزی مقاموں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ بس جس جگہ بادشاہ امراء یا نوابین اپنے دربار کرتے ہیں وہی جگہیں تہذیبی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ قدیم تاریخوں میں قاہرہ اور بغداد، اصفہان اور شیراز، لندن اور پیرس، ایتھنس اور روم، غرناطہ اور قرطبہ، ٹکسلا اور نالندہ، سمرقند اور بخارا، پاٹلی پتر اور بنارس اسی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جب ۱۷۷۵ء کے قریب لکھنؤ کو بھی اودھ کا دارالسلطنت بننے کا موقع ملا تو اس کو بھی تہذیبی اور علمی حیثیت حاصل ہو گئی اور قدرے سیاسی امن اور معاشی فارغ البالی کی وجہ سے تھوڑی ہی مدت میں "ہند اسلامی تہذیب" کی وہ نئی شکل وجود میں آگئی جو بعض حیثیتوں سے دہلی اور دوسرے مقامات کی تہذیبوں سے ممتاز اور مختلف تھی اور جسے عبدالحلیم شرر نے "مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ" قرار دیا ہے۔

علم و ادب کی روایتیں تاریخی اور جغرافیائی حالات، معاشی اور سماجی محرکات کا نتیجہ ہوتی ہیں ان کا تسلسل ایسے پہلو پیدا کر دیتا ہے جو کسی خاص مرکز کی تہذیب اور ادب کا امتیازی نشان بن جاتے ہیں اور اسی سے ربط یا وابستگی رکھنے کی بنا پر ایک مرکز یا دبستان کے لوگ دوسرے مرکز کے لوگوں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ میں جس تہذیبی اور تمدنی زندگی کا نشو و نما ہوا وہ اپنی بنیادوں میں اس زندگی سے مختلف نہ تھی جو کئی صدیوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں اور خاص کر دہلی میں تشکیل پذیر ہوئی تھی، اس کے ساتھ بھی وہی معاشی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی تصورات وابستہ تھے جن کی نمود دہلی میں تھی۔ لیکن پھر بھی بعض عناصر کی کمی بیشی اور زمان و مکان کے معمولی فرق نے لکھنؤ کی تہذیب میں کچھ اور خصوصیتیں پیدا کر دی تھیں جن کا عکس یہاں کی علمی اور ادبی زندگی میں نظر آتا ہے۔ یہ خصوصیتیں اکثر و بیشتر مکمل اختلاف کی شکل میں نہیں، افراط و تفریط کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور جو فضا پیدا کرتی ہیں وہ اس کے پیشرو تہذیبی ماحول سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔

جب اٹھارہویں صدی میں دہلی کی مغل حکومت "شیر و سناں" کی منزل سے نکل کر "طاؤس و رباب" کی منزل میں داخل ہوئی تو اودھ میں بھی ایک نیم خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے قائم کرنے والے محمد امین برہان الملک سعادت خاں تھے جن کی رگوں میں بھی خون گردش کر رہا تھا وہ نیشاپور ایران کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی مجاہدانہ کارگزاریوں کے لئے مشہور تھے۔ یہیں اس پہلی خصوصیت کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جسے لکھنؤ کی تہذیب میں ایرانیت یا عجمیت کے عنصر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گو دہلی کی درباری اور جاگیردارانہ فضا اس اثر سے محفوظ نہیں تھی۔ لیکن یہاں اس کا اثر زیادہ گہرا اور نمایاں تھا۔ کیونکہ اس دفعہ اس میں شیعیت بھی شامل تھی۔ اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ اس کا اظہار لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں فرقہ پرستی، تنگ نظری یا عصبیت کی شکل میں نہیں، ایک عقیدے سے جذباتی وابستگی کی شکل میں ہوا اور چونکہ حکومت اور عوام دونوں نے اس سے گہرے شغف کا اظہار کیا اس لئے اس کا اثر یہاں کی علمی اور ادبی زندگی موسیقی، فن تعمیر اور دوسرے چھوٹے چھوٹے فنون لطیفہ پر پڑا۔ علمی حیثیت سے یہ ہوا کہ فارسی اور عربی

علوم کو دوبارہ زندگی ملی، فقہ، حدیث، تفسیر، ادب، منطق اور طب کی تعلیم عام ہوئی۔ علماء اور فضلاء کی محفلوں سے باہر عام گفتگو میں بھی فارسی عربی الفاظ، فقرے، تلمیحات اور اصطلاحات رائج سکوں کی حیثیت سے جگہ پا گئے اور زبان دانی کا معیار دہلی سے مختلف ہو گیا۔ ابتداء میں یہ بات غیر شعوری رہی ہوگی کیونکہ لکھنؤ کے کوچہ و بازار، مسجد و منبر، فوج اور دربار دہلی سے آنے والے مہاجرین سے بھرے ہوئے تھے لیکن رفتہ رفتہ مقامی اثرات، انفرادیت اور خود اعتمادی کے جذبے نے غیر واضح اور چھوٹے چھوٹے اختلافات کو شعوری بنا دیا، اس طرح لب و لہجہ اور محاورات، الفاظ کے ترک و قبول اور طرز اظہار میں فرق آیا تو ادب کی دنیا بھی بدل گئی۔ یہ بات پھر یاد دلا دینا ضروری ہے کہ فرق بنیادی نہ تھا۔ ان کا تعلق مسائل حیات اور فلسفۂ زندگی سے نہ تھا، ماضی، حال اور مستقبل کے نئے تجربے سے نہ تھا، تاریخ کے کسی نئے تصور، شاعری کے کسی دوسرے نظریے سے نہ تھا۔ یہ فرق زمان و مکاں کے معمولی تغیر کا نتیجہ تھا۔ اور جاگیردارانہ انحطاط پذیر تہذیب کے دائرے کے اندر ہی اس کو بھی جگہ تھی اگر اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہاں کے شعر و ادب میں زبان و بیان کی اہمیت، لب و لہجہ پر زور، تصنع اور رعایت لفظی، حسن و عشق کے خارجی لوازم اور ایک قسم کی [illegible] کے ساتھ ساتھ ادنیٰ پائے کے اخلاقی تصورات، پرستاری فن، شعر و ادب کو تہذیبی زندگی کا جزو بنا دینے کی کوشش، ساری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔

(باقی آئندہ)

ہماری صحافت

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

۲۴۔ مخبر عالم۔ مراد آباد ایڈیٹر قاضی عابد علی رضوی، قمر مراد آبادی
ایم علی بن عابد رضوی

۲۵۔ جمہوریت بمبئی " حامد الانصاری غازی

۲۶۔ جمہور (پندرہ روزہ) علی گڑھ ایڈیٹر محمد فرخان قمر

۲۷۔ علی گڑھ " " مینا زبیری

۲۸۔ علیگ " " ایم احمد، عرفان اللہ
، خمیر احمد، اور شبیر حسن۔

۲۹۔ سلور جوبلی گزٹ " " شریف الحسن بگرامی (اسسٹنٹ ایڈیٹر)

۳۰۔ ہماری زبان ہفتہ وار " آل احمد سرور

۳۱۔ الکلام " بنگلور " سید غوث محی الدین

۳۲۔ جمہور " " " احمد اللہ خاں

۳۳۔ عرفان میل " " " نشی ممتاز فاروقی

۳۴۔ غول " " " شہاب یزدانی

۳۵۔ مہک " سہارنپور " زکریا اسعدی

۳۶۔ ذوالقرنین " بدایوں " محمد حمید الدین نظامی

۳۷۔ پیام دکن " حیدرآباد دکن " شیخ محمد بی۔اے (عثمانیہ)

۳۸۔ مقامات " محبوب نگر " کے وینکٹ رام

۳۹۔ الفاروق " کامٹی " عبد الستار فاروقی

۴۰۔ فنکار " بمبئی " شمس کنول

۴۱۔ پرواز " ورنگل " خواجہ نصیر الدین حسن

۴۲۔ روشنی " سری نگر کشمیر " اے عزیز

۴۳۔ ناقد " بلند شہر " پرتھوی راج

۴۴۔ نئی کرن " تورجہ " گنگا دری لال

۴۵۔ ہمدرد " اکولہ " عبد الصمد جاوید

۴۶۔ سنگم " دانا پور کینٹ پٹنہ " غلام سرور

۴۷۔ ریاست " دہلی " سردار دیوان سنگھ مفتون

۴۸۔ سوویت دیش (پندرہ روزہ) " " جی۔ ایس۔ سوٹ

۴۹۔ سوویت یونین کی خبریں اور رائیں نئی دہلی " " " "

۵۰۔ آج کا امریکہ "

۵۱۔ اردو (پندرہ روزہ) جون پور " ظفر الحسن ظفر صدیقی

۵۲۔ آدم زاد لاہور محمد شفیع، ممتاز احمد خاں، عبد اللہ بٹ

۵۳۔ عبرت " کلکتہ " جوہر غازی پوری

۵۴۔ شاکر " مدراس " حامد علی شاکر

۵۵۔ قومی زبان " کراچی " عین الدین (باقی)

(مطہر پرویز پرنٹر پبلشر نے [illegible] پریس میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا)